اسلام کی حکیمانہ سائنسی توجیہہ مہیا کرنا' مسلمانوں کی حیاتیاتی ضرورت ہے

مَیں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ مہیا کرنا مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے' جس کو وہ صرف اپنی زندگی کی قیمت پر ادا کر کے ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ اقدام بہترین مدافعت ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس جنگ کی صورت میں درست ہے جو ایک ریاست کو فوجی محاذ پر لڑنی پڑتی ہے' اسی طرح سے اس جنگ کی صورت میں بھی درست ہے جو اس کو نظریاتی محاذ پر لڑنی ہوتی ہے۔ اگر ہم بروقت اور اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے' اسلام کی مدافعت کے لئے دوسرے نظریات کے علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ کھول سکیں تو ممکن ہے کہ پھر اسلام کی مدافعت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اور ہم دیکھیں کہ جس نظریۂ حیات کی مدافعت کے لئے ہم آخر کار باہر نکل رہے ہیں وہ وہ نہیں جس کی مدافعت کے لئے ہمیں کل تک باہر نکلنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ لیکن جب تک ہم اس طریق پر جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے' اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ پیدا نہ کریں ہم اس وقت تک علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہیں کھول سکتے۔ کام کی فوری ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ہمیں اپنے بہترین اور سب سے زیادہ زوردار دماغوں کو اس کام پر لگانا چاہئے' تاکہ یہ جلد از جلد اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے۔ ہمیں چاہئے کہ ہر پائی جو میسر آ سکتی ہے' اس کام پر لگا دیں اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ جب تک کام ختم نہ ہو جائے پوری تن دہی کے ساتھ اسی کام میں مصروف رہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مستشرقی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق کے کاموں کو کلیتاً بند کرنا چاہئے' لیکن ہمیں یقیناً مستشرقی تحقیق کے کام کو خواہ ہم آئندہ اس کو کسی نام کے ساتھ جاری رکھنا پسند کریں' یونیورسٹیوں تک محدود کر دینا چاہئے' تاکہ اسلامی تحقیق کے غلط اور فریب کارانہ لقب کے ساتھ' جو درحقیقت حیلہ ساز عیسائیت نواز مستشرقی ذہنوں کی پیداوار ہے' وہ ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں میں دخل انداز نہ ہو سکے۔

(اسلامی تحقیق کا مفہوم' مدعا اور طریق کار' صفحہ ۳۰' تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

بعض وقت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فوری اور شدید ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے نہ سمجھ لیں ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں! اس وقت ٹھیٹھ اسلام ہی کی مختلف توجیہات کی جا رہی ہیں' لہٰذا ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس سے ہم نے ایک نیا قانونی نظام اخذ کرنا ہے۔ جب اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ جو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے' موجود ہو جائے گی تو پھر وہ نہ صرف غیر مسلموں کے تمام غلط نظریات اور فلسفوں کی مکمل اور ایمان پرور تردید کرے گی بلکہ اسلام کی ان غلط اور بے بنیاد توجیہات کا بھی مکمل اور یقین افروز ابطال کرے گی جو اُن مسلمانوں نے پیش کی ہیں جو اسلام کے جدیدیت زدہ' کوتاہ اندیش مسلمان نکتہ چینوں کو مطمئن کرنے کے لئے اسلام کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ فقط ایک ہی بنیاد ہے جس پر ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ایسی توجیہہ فی الواقع وجود میں آئے گی تو ہم دیکھیں گے کہ احکامِ اسلامی کی علتوں اور حکمتوں کے کھل جانے کی وجہ سے اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کے بہت سے مشکل مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں اور اس کا سارا کام نہایت آسان ہو گیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۱)

یقین کے فقدان کے دَور میں اسلام کے قانونی نظام کی تشکیلِ جدید کا نعرہ۔ بے وقت کی راگنی

مسلمانوں کی زندگی کے اس مرحلہ پر جب اسلام پر ان کا یقین گر رہا ہے' اسلام کے قانونی نظام کی تشکیل جدید ایک بے وقت کی کوشش اور ایک بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلام کے موجودہ قوانین بہتر نہیں' بلکہ بدتر ہو جائیں گے۔ مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستہ پر راہنمائی کرتی ہے وہ علومِ قدیمہ و جدیدہ کا علم ہی نہیں' بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور بھی ہے۔ انحطاطِ دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں

تو صعب و مشکل ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن ہو' نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ اور ائمہ اور صلحاء کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے اسلام کے اخلاقی اور مذہبی ضبط کے ماتحت رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے' لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس وقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے اور اس وقت تک ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح بدلنا چاہئے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کو کم از کم اسلام کے ان اخلاقی اور مذہبی قوانین کی روشنی میں نہیں بدل سکتے' جن کی خلاف ورزی ہم دن رات کرتے ہیں۔ (ایضاً' صفحہ ۳۲)

اجتہاد کی موجودہ خواہش غیر اسلامی نظریات سے محبت کا نتیجہ ہے

سچا اجتہاد ہمیشہ اسلام کی گہری محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور ﷺ اور صحابہؓ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لئے ہماری موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں' بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت اور ستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے ان خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لئے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل میں چاہتے اور بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کو اس ''حکمت'' اور ''دانائی'' سے بہرہ ور کیا جائے جو ہم نے دوسرے نظریات سے سیکھی ہے اور اس طرح سے اسلام کو ایک نئے ''حسن و جمال'' سے اور ایک نئی ''شان و شوکت''

سے جن کا نظارہ ہم ان نظریات کی قیادت میں کر چکے ہیں' ''مزین'' کیا جائے۔ یہ سچا اجتہاد نہیں' کیونکہ یہ وہ اجتہاد نہیں' جو شریعت کی قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے' بلکہ یہ شریعت کی تحریف ہے جو ہم اپنے توہمات کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں یا ایک ایسی کوشش ہے جس سے ہم دوسرے نظریات کو جنہیں ہم پسند کرتے ہیں' جہاں تک ہمارا بس چلتا ہے اسلام کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ سچا اجتہاد اس وقت ممکن ہوگا جب ہم اسلام سے پھر ایسی ہی محبت کا احساس کرنے لگیں گے جیسی کہ پہلے ہمارے دلوں میں تھی اور ہم اس شریعت کو جس پر حضور ﷺ اور صحابہؓ کا عمل تھا' پھر ایسی ہی محبت کی روشنی میں پوری طرح سے سمجھنے لگیں گے۔ جب تک ہمیں اسلام کی محبت کا یہ مقام پھر حاصل نہیں ہو جاتا ہم اسلام کی اس بصیرت سے محروم رہیں گے جس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے یا نہیں کہ ہم شریعت کی روشنی میں اس کی اصلاح کے لئے نئے قوانین وضع کریں۔ اگر حضرت عمرؓ کو یہ بصیرت حاصل تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ عام بے یقینی کے اس دَور میں یہ بصیرت ہمیں بھی حاصل ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۳' ۳۴)

انحطاط کے دَور میں متقدمین کی تحقیق کی اہمیت

جس چیز کو ہم معاشرہ کا ایک ناگزیر ارتقائی تغیر سمجھ رہے ہیں' جو ہمارے خیال میں اجتہاد اور نئے قوانین کا تقاضا کرتا ہے' وہ درحقیقت مغرب کی تقلید میں ہماری عام اخلاقی گراوٹ' غیر اسلامی نظریات سے ہماری محبت اور اسلام کے اخلاقی اور دینی ضبط اور نظم سے ہماری نفرت اور بغاوت کے عوامل ہیں' جو ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کر رہے ہیں۔ یہ تمام حالات اسلام پر ہمارے یقین کے انحطاط کی علامات کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔ موجودصورت میں ہمارا اجتہاد جو باطل ہوگا' ان افسوس ناک حالات کو بہتر نہیں' بلکہ بدتر بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اجتہاد شریعت کے وقار کو اور اس کے ساتھ پورے عالم اسلام کے وقار کو اور کم کرے گا' جس سے ہمارا یقین اور متزلزل ہو جائے گا اور ہم میں سے بعض لوگ جن کا ایمان پہلے ہی کمزور ہے' ناحق اور ناروا طور پر

یہ سمجھنے لگیں گے کہ اسلام ایک وقتی نظریۂ حیات تھا جو حالات کے ساتھ بدل گیا ہے۔ لیکن اسلام کی ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ ایسے اجتہاد کو سچے مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کیا اور اس کے باوجود سچا اسلام ہمیشہ زندہ اور باقی رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے کہا ہے کہ یقین و ایمان کے انحطاط کے اس دَور میں متقدمین کے قدم پر چلنا اس سے بدرجہا بہتر اور محفوظ تر ہے کہ ایسے لوگوں کا اجتہاد قبول کیا جائے جو نورِ ایمان سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان حالات کا صحیح علاج یہ نہیں کہ ہم نئے قوانین وضع کریں جو ہمارے اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور سطحی طور پر بدل سکتے ہیں' بلکہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ ہم اسلام کے جدید نظامِ تعلیم کو نافذ کریں جس میں خدا کا تصور تمام طبیعیاتی' حیاتیاتی اور نفسیاتی یا انسانی اور اجتماعی علوم کو منظّم کرنے والا محوری اور مرکزی تصور ہو۔ صرف ایسا نظامِ تعلیم ہی فرد کو ذہنی طور پر پوری طرح سے بدل کر درست کر سکتا ہے۔ یہ نہ تو کوئی دیانت داری ہے اور نہ انصاف کہ ہم پہلے خود ہی ایک ایسا تعلیمی اور ثقافتی ماحول پیدا کریں جس میں فرد کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت صرف اس طرح سے ہو سکے کہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے اور پھر یہ شکایت کریں کہ اس کے اعمال و افکار درست نہیں اور ایسے قوانین وضع کریں جو اس کے نادرست اعمال میں ایک بیرونی مصنوعی دباؤ کی صورت میں رکاوٹ پیدا کریں۔ قوانین صرف وہاں کام کرنے کے لئے وضع کئے جاتے ہیں جہاں تعلیم ناکام رہ گئی۔ ہمارے لئے اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ ہم تعلیم کی دلوں کو بدلنے والی اصلی قوت کو آزمائے بغیر قوانین کی مصنوعی قوت سے کام لیں جو ہمارے ظاہری اعمال کو بھی بدل نہیں سکتی۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہم معاشرہ کو جدید اسلامی نظامِ تعلیم کے ذریعہ سے حقیقی معنوں میں اور بنیادی طور پر بدلنے کی بجائے اسے مصنوعی اور سطحی طور پر بدلنے کے لئے موجودہ اسلامی قوانین کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب قوانین پر عمل کرنے کی نیت موجود نہ ہو تو ان کی زد سے بچ کر نہایت آسانی کے ساتھ ان کی خلاف ورزیاں کی جا سکتی ہیں۔ (اسلامی تحقیق کا مفہوم' مدعا اور طریق کار' صفحہ ۳۴)

نظریاتی جنگ میں فتح یابی کے لئے صحیح فلسفۂ تعلیم کی تشکیل کی ضرورت

لیکن جدید اسلامی نظامِ تعلیم جو نہ صرف اسلامی ہونا چاہئے' بلکہ علمی اور عقلی لحاظ سے بھی محکم اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے' اس بات پر موقوف ہے کہ آیا ہم تعلیم کا کوئی معقول اور صحیح فلسفہ جو لازماً اسلامی فلسفہ ہوگا' پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں اور تعلیم کا ایسا فلسفہ انسان اور کائنات کی صحیح علمی اور عقلی توجیہہ دوسرے لفظوں میں اسلام کی سائنسی اور حکمیاتی توجیہہ کے ایک جزو کے طور پر ہی وجود میں آ سکتا ہے' ورنہ وجود میں نہیں آ سکتا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی یہی سائنسی اور حکمیاتی توجیہہ ہے جو اسلامی نظام قوانین کی ایک ہی ممکن بنیاد بھی ہے۔ غرض ہم جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں ہماری فوری ضرورت یہ نہیں کہ ہم اسلام کے قوانین کو بدل دیں' بلکہ یہ ہے کہ ہم اصلی اور صحیح قسم کی اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ پیدا کر کے اسلام پر اپنے ایمان کو تازہ کریں اور اسلام کی صحیح علمی اور عقلی واقفیت سے اپنے آپ کو مسلح کریں' تاکہ محض عالم انسانی کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے ہم جس نظریاتی جنگ میں مجبوراً شریک ہیں اس میں فتح پائیں اور شکست کھا کر مٹنے سے محفوظ رہیں۔ (ایضاً' صفحہ ۳۵)

مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت کی قرآنی دعوت

قرآن نے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت پر کیوں زور دیا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ خدا کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے اور جب تک انسان خدا کی ستائش' عبادت اور اطاعت کے ذریعہ سے خدا کی محبت کا اظہار نہ کرے اس کی شخصیت نشو ونما پا کر اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی اور اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں ان مسرتوں اور راحتوں کو نہیں پا سکتی جو اس کے کمال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خدا کی محبت کے ذریعہ سے انسانی شخصیت کی تکمیل ہی مقصدِ کائنات ہے' لیکن خدا کی محبت جو انسان کی فطرت میں ہے' خدا کی معرفت کے بغیر بیدار نہیں ہوتی اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان خدا کی صنعت یعنی کائنات کو دیکھے' اس

لیئے ہوئے خدا کا ذکر کریں وہاں ان سے اس بات کی بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق ﴿خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ پر غور کریں۔

خدا کی خالقیت وربوبیت کے نشانات کا کائنات کی تینوں سطحوں پر موجود ہونا

۱) قرآن کی رو سے خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے نشانات کائنات کی تینوں سطحوں پر موجود ہیں۔ مادی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم چاند' سورج اور ستاروں کی حرکت کا' برق وسحاب کا' ہواؤں کے چلنے کا' اختلافِ لیل ونہار کا' مینہ برسنے کا' چاند کے گھٹنے بڑھنے کا' پہاڑوں کا' زمین کی ہموار سطح کا' پہلے آسمان اور زمین کے یکجا ہونے اور پھر الگ الگ ہونے کا اور اس طرح کے اور مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اگر ہم ان مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ کا حق ادا کر کے ان کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سمجھ لیں اور ان کے تمام رموز واسرار سے اور خدا کی ان تمام حکمتوں سے جو ان کے اندر پوشیدہ ہیں' پوری طرح آگاہ ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبیعیاتی علوم (Physical Sciences) وجود میں آ جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام سائنسی حقائق ایک سلسلہ یا نظام بناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ علمی وعقلی ربط و ضبط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دلالت اور راہنمائی کرتے ہیں۔

۲) اسی طرح سے حیاتیاتی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآنِ حکیم زمین سے روئیدگی کے نمودار ہونے کا' لہلہاتی کھیتیوں کا' غلہ پیدا کرنے کا' مختلف رنگوں اور ذائقوں کے پھلوں کا' پانی سے ہر جاندار کے زندہ ہونے کا' مٹی سے انسان کی تخلیق کے آغاز کا' زمین سے نسل انسانی کے اگنے کا' زمین میں ہر قسم کے جانداروں کے پھیل جانے کا' پرندوں کے اڑنے کا' سواری کے کام آنے والے اور دودھ دینے والے چوپایوں کا' نباتات اور حیوانات کے ازواج کا' اونٹ کی حیرت انگیز جسمانی ساخت کا' انسان کی قوتِ فہم ودید وشنید کا اور ماں کے رحم میں انسانی جنین

کی حالتوں کے تدریجی تغیر کا اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم ان مظاہر قدرت کا پورا مشاہدہ اور مطالعہ کریں' یہاں تک کہ ان کے تمام اسرار و رموز سے آشنا ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) مکمل طور پر وجود میں آ جائیں گے۔

۳) پھر اسی طرح سے نفسیاتی یا انسانی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآنِ حکیم انسانی تاریخ کے بعض اہم واقعات اور قوانین کا اور انسانی فطرت کے بعض بنیادی قواعد اور حقائق کا ذکر کرتا ہے' مثلاً قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے تاریخِ عالم میں پے در پے ایسے انسانوں کا ظہور ہوتا رہا جنہوں نے کہا کہ وہ خدا کے رسول ہیں اور لوگوں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ ان کا سچا معبود خدا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے' کس طرح سے رسولوں کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کر لیا اور بعضوں نے قبول نہ کیا' کس طرح سے قبول کرنے والوں کے دل اطمینان اور مسرت سے بھر گئے' یہاں تک کہ وہ خدا کے لئے طرح طرح کی مصیبتیں اور ذلتیں اٹھانے بلکہ مرنے کے لئے تیار ہو گئے' کس طرح سے انکار کرنے والوں کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا' یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو گئے۔ کس طرح سے خدا کی محبت یا دین انسان کی فطرت میں ہے جو لازوال اور غیر مبدل ہے' کس طرح سے خدا کی عبادت انسان کے دل کو مطمئن کرتی ہے' کس طرح سے نوعِ انسانی اپنی فطرت کے اصلی تقاضوں کو بھولنے اور مختلف قسم کے غلط اور جھوٹے معبودوں کو اپنانے کی وجہ سے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور کس طرح سے ان کے اتحاد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے سچے معبود کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں' کس طرح سے انسان کے دل میں نیک و بد' درست اور نادرست اور خوب و زشت کو پرکھنے کا ایک معیار موجود ہے' جو خواہ انسان اس سے گریز کے بہانے بناتا رہے' ہر وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ پھر انسانی لاشعور کے بعض ایسے وظائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کو ماہرین نفسیات نے حال ہی میں سمجھا ہے' قرآن حکیم ہمیں

بتاتا ہے کہ کس طرح سے انسانی فرد کے تمام چھوٹے اور بڑے اعمال اس کے وجود میں نامۂ اعمال کی صورت میں محفوظ رہتے ہیں اور کس طرح سے یہ نامۂ اعمال موت کے بعد انسان کے سامنے کھل جائے گا اور وہ کہے گا کہ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا فعل ایسا نہیں جو اِس کے اندر لکھا نہ گیا ہو۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اگر ہم ان حقائق کا پورا پورا تجزیہ کریں اور ان کے معانی اور مطالب اور ان کے نتائج و مضمرات اور اسباب و عوامل پر پوری طرح سے حاوی ہو جائیں تو تمام انسانی علوم (Human Sciences) اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ وجود میں آ جاتے ہیں۔ (ایضاً' صفحہ ۴۴۔۴۷)

☆ ☆ ☆

بقیہ: وحدتِ ادیان کا باطل تصور

جب تک حضرت مسیحؑ نہیں آئے' یہ دَور حضرت موسٰیؑ کا رہا' اس میں جو یہودی یعنی حضرت موسٰیؑ کے پیروکار تھے اگر ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان تھا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کے دور میں جو بھی اللہ پر' حضرت مسیحؑ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا تھا اور اس کا عمل درست تھا تو اس کے لئے کوئی خوف و حزن نہیں اور اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔ گویا انبیاء کرامؑ کے ساتھ صرف منسوب ہونا نجات کی ضمانت نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ساتھ ساتھ اللہ اور آخرت پر ایمان' جس کے نتیجے میں عمل درست ہو جائے' لازم ہے۔ یعنی اصل بنائے نجات اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے' محض کسی گروہ' اُمت یا شخصیت کے ساتھ وابستگی نجات کی ضمانت نہیں۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم ○○

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا (۳)

تحریر: حامد سجاد طاہر☆

بیچ کی راہیں

علی گڑھ اور دیوبند دو انتہاؤں کا نام تھا۔ لہٰذا کئی ایسی تحاریک نے سر اٹھایا جنہوں نے اس Thesis اور Antithesis کے مابین synthesis کی راہ تلاش کی۔ اس مساعی میں یوں تو بہت سے افراد نے حصہ لیا لیکن یہاں ہم صرف ان افراد کا تذکرہ کریں گے جن کی تحاریک نے دار العلوموں کی شکل اختیار کی' یا پھر آخر میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ کریں گے جس نے ایک ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

(۱) مولانا شبلی نعمانیؒ اور دار العلوم ندوہ

مولانا شبلی نعمانی پہلے علی گڑھ میں پڑھاتے تھے اور تب وہ ''پروفیسر شبلی'' کہلاتے تھے' مگر پھر آپ نے یہ محسوس کیا کہ علی گڑھ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کا حق ادا نہیں کر سکتا' لہٰذا ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء میں آپ کی تجویز پر دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تا کہ وہ افراد جو جدید علوم سے مزین ہوں وہ دینی علوم سے بالکل کورے نہ ہوں۔ تاہم اس ادارے میں باقاعدہ تدریس کا آغاز وسائل کی قلت کے باعث عملاً ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ قدیم اسلامی نصاب جدید تقاضاؤں کے ساتھ پیش کیا جائے گا اور جدید علوم کو بھی شامل نصاب کیا جائے گا' لیکن عملاً کئی برس تک اس میں وہی پرانا نصاب پڑھایا جاتا رہا' یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی بذاتِ خود حیدر آباد سے منتقل ہو کر یہاں آئے تو اصلاح کا کچھ عمل شروع ہوا۔ درسِ نظامی میں سے قدیم فلسفہ و منطق کو نکال کر فلسفۂ جدید کو شامل نصاب کیا گیا۔

☆متعلم قرآن کالج لاہور

انگریزی زبان کی تدریس کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ مزید برآں صرف ونحو کے مقابلے میں ادب وانشاء پر زیادہ زور دیا گیا۔ پرانے نصاب میں سے تفسیر، عقائد اور شریعت کو بھی مناسب جگہ دی گئی۔

ندوہ نے چند ایسے مصنفین کی ٹیم تو ضرور تیار کر دی جس نے تاریخ، سیرت، ادب اور صحافت میں قابل قدر کام کیا، ان میں سے سب سے زیادہ نمایاں سید سلیمان ندوی تھے، مگر پھر بھی اعلیٰ علمی سطح پر کوئی بہت گہرا اثر چھوڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس ضمن میں اگر کچھ کام ہوا بھی تو مولانا شبلی نعمانی کے غیر ندوی شاگردوں نے کیا، یعنی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حمید الدین فراہی۔

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد اور دارالارشاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی اصل شہرت تو دراصل ایک داعی اور مفسر قرآن کی تھی۔ ہمارے ہاں بالعموم دعوت کا کام ایسا ہے جس کے لئے عموماً کسی تربیت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ تاہم انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ قرآن کی دعوت کو اس دور میں عوامی ہی نہیں علمی سطح پر پیش کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا انہوں نے علی گڑھ اور دیوبند کی چپقلش سے تنگ آ کر اور ندوۃ العلماء کی مساعی سے مایوس ہو کر ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ ایک نئے ادارے دارالارشاد کی بنیاد رکھی جس کا مقصد خود اُن کے الفاظ میں قوم میں بکثرت ایسے افراد تھوڑے وقت اور زیادہ علم وفکر سے پیدا کرنا تھا جو قرآن حکیم کی دعوت وتبلیغ کی خدمت اور اصلاح وارشادِ اُمت کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ تاہم یہ ''اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم'' کے مصداق یہ ادارہ اپنے اوّلین ایام میں ہی اپنے بانی کی سیاست میں زیادہ دلچسپی کے باعث عملاً غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔

(۳) مولانا محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ

تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے دوران ہی بہت سے افراد نے یہ محسوس کیا کہ سرکاری گرانٹ ملنے کی وجہ سے علی گڑھ پر سرکار نوازی کے اثرات بہت زیادہ

غالب ہیں' چنانچہ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی اصلاح کے لئے کاوشیں شروع کیں' مگر اس میں ناکام ہونے کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کی عمارت کے قریب ہی خیمے لگا کر جامعہ ملیہ کی ابتدا کی' جو مولانا جوہر کی ہمت اور جذبے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بعدازاں ۱۹۲۵ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ مولانا نے اس ادارے کے تعارفی کتابچے میں یہ لکھا کہ ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اپنی درس گاہوں میں ایسے نوجوان پیدا کریں جو زمانے کے معیار کے مطابق تعلیم یافتہ و تربیت یافتہ شمار کئے جانے کے قابل ہوں۔ نیز وہ صحیح معنوں میں مسلمان بھی ہوں' جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب سے مکمل طور پر آگاہ بھی ہوں۔ اس ادارے میں سرکاری ملازمت سے بے نیاز کرنے کے لئے صنعت و حرفت اور دستکاری کی تعلیم کو بھی لازم کیا گیا تھا' ساتھ ہی دینی تعلیم کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ تاہم یہ بھی کوئی خاص کام سرانجام نہ دے سکا۔ مزید برآں حکومت کے عدم تعاون اور وسائل کی قلت کے باعث بھی یہ تحریک وسیع اثرات کی حامل نہ ہو سکی اور پھر وطنی قومیت کی حمایت اور دوقومی نظریئے کی مخالفت کے باعث مسلمانوں میں اسے قبولِ عام بھی حاصل نہ ہو سکا۔

(۳) علامہ اقبال اور دارالسلام

یہ وہی دَور تھا کہ جس میں علامہ اقبال جیسی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو شخصیت ابھری جس نے علی گڑھ کی تقلید مغرب اور دیوبند کے جمود دونوں کو ہی نشانۂ تنقید بنایا اور ان کے مابین ربط کا مشورہ دیا۔ انہوں نے جدید مغربی نظامِ تعلیم کے فارغ التحصیل انسان کے متعلق یہ کہا:

> ''اسے محسوس یعنی اس قسم کی فکر کی عادت ہوگئی ہے جس کا تعلق اشیاء و حوادث کی دنیا سے ہے' لہٰذا اب ہمیں انہیں پھر اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے اور فکر اسلام کی تشکیل نو کے لئے کسی ایسے منہاج کی ضرورت ہوگی جو نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے''۔

خود اقبال نے اسی منہاج کو یعنی مخاطب کی نفسیات کو پیش نظر رکھنے کو اپنی شاعری

میں بھی روا رکھا اور خطبات میں بھی۔ شاعری میں اسلام کے قصیدے پہلے بھی بہت گائے گئے تھے۔ حالی اور اکبر نے بھی گل و بلبل، عاشق و معشوق اور شمع و پروانہ کی روایتی شاعری کو چھوڑ کر قومی شاعری کی تھی مگر اس کی وجہ سے حالی کا کلام بہت سادہ اور پھیکا ہو گیا تھا جبکہ اکبر کو اپنی شاعری میں شوخی و ظرافت سے کام لینا پڑا۔ لہٰذا انہیں بھی کوئی زیادہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی، لیکن اقبال کی خاصیت یہ ہے کہ آپ نے شاعری کی انہی اصطلاحات و تلمیحات سے کام لیا جو اس زمانے میں مروّج تھیں اور اس طرح کلام میں نفسیات کو پیش نظر رکھا۔ آپ نے فارسی میں شاعری بھی کی جو اُس وقت کی اعلیٰ شعری زبان مانی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اردو میں بھی شعر کہے جو اُس وقت کی نسبتاً عوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اور پھر آپ نے خطبات میں ایک طرف تو مخاطبین کے دین کو پیش نظر رکھتے ہوئے انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا اور پھر ان ہی اصطلاحات اور طرزِ استدلال کو اپنا کر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل دیئے گئے اقتباس میں آپ نے اپنے خطبات کا منہاج ہی وضع کرنے کی کاوش کی ہے۔

آپ نے نقل اور عقل کے مابین ایک پل تعمیر کرنے کو اسلام کا موجودہ دَور میں اصل چیلنج قرار دیا۔ اس کے لئے آپ نے علی گڑھ اور دیوبند کی خصوصیات کو اکٹھا کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے علی گڑھ کی سائنس کے ذریعے آیاتِ آفاقیہ کے مطالعے کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتلا دیا کہ۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

اور پھر اُن کی مغرب کی اندھی تقلید کو بھی موردِ لعن و طعن ٹھہرایا۔

اُس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ!

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ!

اسی طرح آپ نے دیوبند کے ایک خاص طبقے کے ایمان کو بچا لینے کی کاوشوں کی تعریف کی ۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو!

اور شیطان کی زبان سے یہ الفاظ بھی کہلوا دیئے ۔

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اِس اُمت سے ہے!
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

تاہم ان کی جدید سائنس اور فلسفے سے بیزاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

آئینِ نو سے ڈرنا ' طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!

یہی وجہ ہے کہ آپ نے علی گڑھ اور دیوبند کی چپقلش پر اور ان کی کمیوں کو ایک خطبے میں یوں جمع کیا۔

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہہ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بُتکدے میں کھو گیا کون؟

آپ نے علم کو جدید اور قدیم جیسی اصطلاحات سے مقید کرنے کو غلط قرار دیا اور اس قصہ کو ختم کرتے ہوئے یہ کہا ع

دلیل کم نظری ' قصۂ قدیم و جدید!

اور پھر اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکالا ۔

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

آپ نے دورِ حاضر کے انسان کی سب سے بڑی غلطی یہ قرار دی کہ وہ اپنی ع
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا!

لہٰذا وہ ۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا!

اور پھر ہر معاملے میں عقل کے دخل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

اور اس کے مقام کو واضح کرنے کے لئے کہا۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغِ رہ گزر ہے!
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے!

لہٰذا آپ نے مشورہ دیا ۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے ' منزل نہیں ہے!

کیونکہ ۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں!

چنانچہ عقل کا استعمال جائز ہے مگر پھر اسی پر قناعت کرنا گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

چنانچہ ع

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول!

مزید برآں آپ نے صرف دُنیوی مفاد یا مادی اشیاء کی جانب توجہ دینے کے متعلق فرمایا ۔

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

انہی خیالات کو لے کر تجلیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم کو یکجا کرنے کے لئے آپ نے دارالسلام کے قیام کا قصد فرمایا۔ لہٰذا اس کام کے لئے ایک ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا اور ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے گاؤں میں چند عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ تاہم اس مرحلے پر پہنچ کر آپ نے جب ہندوستان میں اردگرد نظر دوڑائی تو انہیں کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو اس ادارے میں بطورِ استاد تعینات کیا جا سکے۔ لہٰذا آپ نے جامعہ الازہر (مصر) کے اس وقت کے شیخ علامہ مصطفیٰ المراغی کو ایک خط لکھا جس میں اس ادارے کے قیام کا مقصد واضح کیا اور ساتھ ہی اس کے لئے ان سے ایک معلم کی درخواست بھی کی۔ اس خط کا ایک حصہ باوجود طوالت کے یہاں نقل کرنا مفید ہوگا:

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کے ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور وشغب سے دُور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں جو کہ ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتاب موجود ہو۔ اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو' نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو' مقرر کرنا چاہتے ہیں' تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روح سے واقف

کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے، تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے جہاد کر سکیں''۔

علامہ نے ممکنہ استاد کی مزید خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''چاہئے کہ یہ شخص علومِ شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو، نیز انگریزی زبان پر بھی قدرتِ کامل رکھتا ہو''۔

اور پھر آپ نے اسلام کی عام تبلیغ سے اس کام کو اعلیٰ اور ارفع گردانا اور جامعۃ الازہر کی اُس وقت کی ہندوستان میں مبلغین بھیجنے کی سکیم کی مخالفت کی:

''میں آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مرکز اسلامی کی بنا، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، مقصدِ تبلیغ کے لئے مختلف مقامات پر مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولیٰ و اقرب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف و اکناف میں پھیلے گا''۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ وہاں سے بھی یہ جواب آ گیا کہ ہمارے پاس مطلوبہ معیار کا کوئی شخص موجود نہیں، لہٰذا ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کے مصداق منصوبہ یہیں ختم ہو گیا اور پیشِ نظر کام کے لئے کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔ پھر انہی دنوں آپ قرآن کے طالب علموں کی رہنمائی کے لئے کچھ نوٹس لکھنے پر غور و فکر کر رہے تھے اور نواب بھوپال نے بھی اگرچہ وظیفہ تو غیر مشروط طور پر ہی دیا تھا مگر ساتھ ہی اس کی خواہش بھی ظاہر کی تھی، لیکن کچھ طوالت عمر اور ناسازیٔ طبع اور کچھ نظر کی کمزوری کے باعث وہ اس کام کو اکیلے سرانجام دینے کی ہمت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ لہٰذا آپ نے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان عالم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اس کام میں اپنی معاونت کے لئے بلایا، مگر انہوں نے جواب دیا کہ آج کل میں نسبتاً زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں، لہٰذا یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ تاہم مولانا مودودی دارالسلام آئے اور اپنے ساتھیوں سمیت یہیں کام کیا اور یہیں جماعت اسلامی کا اوّلین دفتر بنا اور شاید تفہیم القرآن بھی آپ نے بعد میں علامہ کی خواہش کے مطابق ہی لکھی ہو۔

علامہ کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو میں یہاں ان کے بعض منفی پہلوؤں کا تذکرہ بھی کرنا چاہوں گا جن کی بدولت آج ان کے نام لیواؤں کی عظیم اکثریت سیکولر مزاج کی حامل ہے۔ یہ بات درست ہے کہ آپ نے قرآن کے ساتھ جو تعلق استوار کیا وہ بہت کم کے حصے میں آیا ہوگا' تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انہوں نے قرآن کی اصل شارح یعنی احادیث نبویؐ کی جانب بہت کم توجہ دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات میں بھی اور شعر و شاعری میں بھی جگہ جگہ ضعیف اور موضوع روایات سے استدلال کیا ہے۔ دوسری طرف کئی صحیح احادیث کو رد کر دیا ہے' مثلاً نزولِ عیسیٰ اور ظہورِ مہدی کے مسائل کو انہوں نے عجمی فکر کا شاخسانہ قرار دیا اور پھر انہوں نے خطابات میں شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد کے تحت جو باتیں کی ہیں وہ بڑی حد تک متنازع بلکہ قابل تنقید ہیں۔

چند دیگر کاوشیں

یورپ میں ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی اور مختلف علومِ عمرانی پر غور و فکر کا کام شروع ہوا اور اس ضمن میں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ جمہوریت اور سرمایہ داری (کیپٹل ازم) جیسے نظام ابھرے۔ جب یورپی اقوام نے اپنا تسلط عالمِ اسلام پر جما لیا تو انہوں نے ان نظاموں کو یہاں بھی رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مسلمانوں کو بھی کچھ ہوش آیا اور انہوں نے بھی اسلام پر بطور ایک نظامِ حیات غور کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً پورے عالمِ اسلام میں مختلف تحاریک اٹھ کھڑی ہوئیں جن سب کے پیچھے اسلام کو بطور ایک نظام غالب کرنے کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ ان تحاریک کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ عوام الناس کے اندر مغرب سے مرعوبیت کچھ کم ہوئی اور اسلام پر کچھ اعتماد بحال ہوا' تاہم اگر ہم بنظرِ غائر ان تحاریک کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحاریک خود بھی بڑی حد تک مغربی فکر سے متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک دین کا مطلب ہی ایک نظامِ حیات بن کر رہ گیا ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈالا گیا ہے۔ یہ مراسمِ عبودیت پر زور تو ضرور دیتی ہیں مگر ان کے کارکنوں میں ایمان نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی۔ ویسے تو یہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کا بھی دم بھرتی نظر آتی ہیں لیکن ان کی

تمام تر مساعی صرف اور صرف دُنیوی کامیابی کے پیچھے گھوم رہی ہے' یہاں تک کہ ان کا ماٹو یہی شعر بن کر رہ گیا ہے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی!

(واضح رہے کہ یہ شعر نعیم صدیقی مرحوم کا ہے۔)

چنانچہ جب زندگی کا مقصد صرف دین کی سرفرازی ہی بن جائے تو پھر علمی کاوشوں کی جگہ سیاسی کام زیادہ اہمیت کے حامل قرار پاتے ہیں اور مسند امارت پر جگہ انہی کو ملتی ہے جو جوشیلی اور جذباتی تقریریں کر سکتے ہوں۔ ذمہ داریوں اور عہدوں کے حق دار اہل علم اشخاص کی جگہ کارکن ٹائپ کے افراد بن جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُمت کی ایک معتد بہ تعداد کے ایمان کی تجدید کے بغیر اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ ان تحریکوں کی ناکامی کا مادی سبب نجانے کیا بیان کیا جائے تاہم اصل وجہ یہی ہے کہ یہ ایمان اور قرآن کی شمشیر کو ہاتھ میں لئے بغیر میدانِ کارزار میں اتر آئے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

چنانچہ ان تحریکوں کا آغاز خواہ کتنے ہی اخلاص سے کیوں نہ ہوا ہو لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تحاریک کی اصل حیثیت مذہبی سے زیادہ سیاسی اور دینی سے زیادہ دُنیوی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام کو ترجیح دیتے ہیں اور اِن کو سود سے پاک اسلامی نظام میں انسانیت کی فلاح نظر آتی ہے' اسی لئے سود سے پاک معیشت کے متعلق ان تمام سیمینارز میں یہی بات زیر بحث آتی ہے کہ کس طرح اس نظام کو اپنا کر ایک بینکار زیادہ سے زیادہ نفع کما سکتا ہے۔ دوسرے جمہوریت پر جان دیتے ہیں' یہ اسلامی انقلاب کی خاطر نعرے لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

(باقی صفحہ 34 پر)

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : رَدِّ قادیانیت کے زریں اصول

مصنف : مولانا منظور احمد چنیوٹی

ضخامت : 440 صفحات

قیمت : 150 روپے

ملنے کا پتہ : (i) چنیوٹی کتب خانہ' محلّہ گڑھا' چنیوٹ

(ii) مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار' لاہور

کتاب کے مصنف مولانا منظور احمد چنیوٹی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تحفظ ختم نبوت کے حوالہ سے اُن کا نام امتیازی شہرت رکھتا ہے۔ وہ ایک ممتاز عالم دین ہیں اور تحفظ ختم نبوت ان کا خصوصی موضوع ہے۔ اس حوالے سے وہ بین الاقوامی طور پر متعارف ہیں۔ اس موضوع پر وہ تیس سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں اردو کے علاوہ بعض عربی میں اور کچھ انگریزی میں ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں ایک خاص ضمنی عنوان کو لے کر اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور قادیانیوں کے عقائد کی نہ صرف قلعی کھولی گئی ہے بلکہ مسکت جواب دیئے گئے ہیں۔ خاص طور پر اس فرقہ کے بانی کی غلط ثابت ہونے والی پیشینگوئیاں' کذب بیانیاں اور فحش گوئی بڑی تفصیل کے ساتھ مع حوالہ جات درج کی گئی ہے۔

مسلمانوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے جس میں کسی مکتب فکر کو قطعاً کوئی اختلاف نہیں کہ